باب ۷

کیا تم نے اللہ کو دیکھا ہے؟

ذات کا عرفان

جب دریافت کیا گیا کہ تم نے خدا کو دیکھا ہے، تو جواب آیا کہ ایسی ہستی ایسی شکل ایسی شے تو نہیں کہ اسے دیکھا جا سکے یا حاصل کیا جا سکے۔ البتہ اس کی ذات کا عرفان ہوتا ہے کہ 'ہے' یہ 'ہے' کی واردات تیقن بالذات ہوتی ہے۔ اور ایک خود آگاہی ہے، ایمان بالغیب ہے کہ مَیں ہوں۔ یہ بڑھتے بڑھتے خود آگہی بن جاتی ہے۔ پھر یہ خود آگہی بھی انفرادیت چھوڑ کر "ہے" کی تجرید میں ضم ہوجاتی ہے۔ اس لئے یہی کہا جاسکتا ہے کہ حقیقت جو ہے وہ "میں ہوں" "تُو ہے" سے ماورا' ایک وجدان و حال کی کیفیت ہے کہ "ہے" بس یہ "ہے" باقی رہ جاتی ہے۔ اب نہ ناظر ہے، نہ منظور۔ ایک نظارۂ جمال ہے۔ ایک "ہے" کی مستی دوام ہے۔

"اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه" ایک کیفِ حال میں حقیقت کی گواہی ہے۔

اس کیف و حال کو یوں سمجھیں کہ ایک باطنی گواہی کی وجہ سے تجسسِ حقیقت انسان کی فطرت میں ودیعت ہے۔ وہ روح کی اپنے اصل سے جدائی میں تڑپ کبھی آرزو بنتی ہے، کبھی طلبِ دیدار۔ وہ آنکھوں کی پیاس، وہ محبوب کے قرب کے لئے بے چینی، وہ محبوب کی آواز سننے کے لئے بے قراری۔ مگر اس روحِ بے تاب ہی کا دیدار کرلینا کسے نصیب ہوتا ہے جو آگے حق کے دیدار کی تمنا کرے۔

انسان اپنے سے باہر نظر کرے تو ذاتِ لامحدود کو ایک آنکھ کے تِل میں بند کرنے کی خواہش سے شرم سار ہوگا۔ حسّی نگاہ کی کی محدودیت اور کائنات عالم کی وسعت در وسعت بس ایک عالمِ حیرت تک ہی اسے پہنچا سکے گی۔ تو پھر دیکھنے سے مراد جھلکیاں کہہ لیں۔ نور کہہ لیں، تجلی، یا ہر حسین موجودات میں نظارۂ جمال کہہ لیں۔ مگر ان میں بھی تشفی کہاں۔ یہاں بھی انجام حیرت در حیرت۔ ظاہر ہے کہ حواسِ خمسہ کی محدودیت پھر اس کے ذریعہ عقلی ادراک کی بساط ہی کیا ہوسکتی ہے۔ لامحدود محدود میں کیسے سما سکتا ہے۔ خیر۔ مادی تخلیق کی بے پناہ وسعتیں چھوڑیں۔ حسن، خوبی، لطافت، وجدان تصور، افکار وغیرہ میں اس معمہ کا حل تلاش کریں۔ وہاں بھی حیرانی۔

اسی لیے شاہکار تخلیق کے لئے جب حق کی محبت جوش میں آئی تو مُرسلین اور صحیفوں کے ذریعے انسان کی رہنمائی فرمائی۔ حضرت علیؓ نے بھی ''مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ'' کہہ کر (کہ جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے حق کو پہچانا) شوق کا اعادہ کر دیا۔ عرفانِ رب کے لیے ایک یقین اور مستحکم راہ کشادہ کر دی۔ یہ رب وہ ہے جس سے میرا ذاتی تعلق ہے۔ اس کے عرفان کے لیے اپنا عرفان ضروری قرار پایا۔ دیکھا جائے تو انسان کو اگر پختہ یقین اور ایمان بالغیب ہوسکتا ہے تو اپنی ذات پر کہ مَیں ہوں۔ اس 'مَیں' میں اتنی صداقت ہے کہ اس کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں پڑتی حالانکہ انسان اپنی جان اور اپنی روح کو دیکھ بھی نہیں رہا ہوتا مگر اسے یقین کامل ہوتا ہے کہ 'مَیں' ہوں بچپن، جوانی، بڑھاپا اس پر سے گذرتا ہے مگر یہ 'مَیں ہوں'' پر سے اس کا یقین کبھی نہیں اٹھتا۔ تو اسی انداز کا عرفانِ حق انسان کو ہو جانے کی امید کی جاسکتی ہے۔

لہٰذا حق کی تلاش، ظاہر کائنات میں کرنے اور اس میں گم ہو جانے کی بجائے یا اس کی وسعتوں میں حیران در حیران رہ جانے کی بجائے، اپنے باطن میں غوطہ زنی کر کے کیوں نہ کی جائے۔ یوں بھی تو انسان کو کائنات کا اجمالی پیکر بتایا گیا ہے۔ اور حق کی صورت، حق کے اوصاف سے اس کو متصف بتایا گیا ہے۔ غور کریں تو یہ جسے ہم اللہ ذات کہتے ہیں اس کی اجمالیت ہر فرد کے باطن میں موجود ہے۔ اور یہ اپنی حقیقی 'مَیں' کے سوا کچھ نہیں۔ اس 'مَیں' کا عرفان عرفَ نَفْسَہٗ ہے مگر اپنی جانِ جان کو کیسے دیکھے۔

اس دیکھنے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ ہے کسی آئینہ ذات میں اپنا دیدار۔ اسے بصیرت کہ لو، حضوری کہ لو۔ اس کے لئے کوئی جمالِ حسنِ ذات کا اکمل پیکر لیں۔ اگر اپنا باطن متجلّی ہوتا ہے تو ایسا اس پیکر کا جلوہ ہوتا ہے کہ نہ جلوہ کا ہوش نہ اپنا، یعنی ھُوَ اللہ۔ یہی اپنی حقیقت کو دیکھ لینا ہوتا ہے۔ گویا اپنی جانِ جان کی بصیرت ہُو اللہ میں ہے۔ کسی آئینہ میں اس 'مَیں' کی تجلی کو دیکھ لینا ہے۔ یہ آئینہ شیخ کی ذات ہے۔

شمسِ حقیقی

اپنا باطن، اپنا قلب متجلّی ہوتا ہے، عشق سے۔ اس لئے جب کسی مرکزِ حق کے طفیل بہ امر اللہ کے سہارے، عشق ذات کی صلاحیت بیدار ہو جائے تو اپنی باطنی صفات کا ظہور ہونے لگتا ہے یہ چونکہ حق کی صفات ہیں، اس لئے اب جو دیکھنا ہوتا ہے، وہ رَاَیْتُ رَبّی بِرَبّی (دیکھا رب کو رب سے) کی سطح کا ہوتا ہے۔ اس لئے مازَاغَ البَصر ہو جاتا ہے۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا کہ پلک نہ جھپکی۔ وہ دیکھنا، وہ بولنا، وہ سننا، وہ سونگھنا گیسوئے مشکیں کا۔ وہ چھلکتا لذتِ

عشق کا، جامِ دیدار کا، جامِ وصال کا، جامِ شہادت کا۔ یہ سب عشق و مستی میں آجانے ہی میں ممکن ہے۔

یہ عشق کی دنیا لطافتوں کی دنیا ہے۔ظہورِ اسماء وصفات کی دنیا ہے۔ یہ (اسماء وصفات الٰہی) جیسے ''حیّ'' علیمٌ قدیرٌ مریدٌ بصیرٌ سمیعٌ کلیمٌ '' جو اپنے باطن میں ہیں، ان کی لطافتوں کا پرتو ہے، جو عشق کے طفیل اجسامِ انسانی پر پڑ رہا ہوتا ہے۔ اور وجودِ انسانی سے نئی حیات، نئی شدّتوں کا ظہور ہو رہا ہوتا ہے۔ اب گویا مجاز سے بھی حقیقت کی جھلکیاں مل رہی ہوتی ہیں۔

اب باطن کو متجلّی دیکھنے کے لئے ذرا روح کی طرف رجوع کریں۔ روح کے نمود اور فروغ کا سورج، وہ شمسِ حقیقت صلی اللہ علیہ وسلم ہے جس کا نور یکتا ہے اور آپ ہی آپ ہے۔ اس کی نمود آفاق سے نہیں بلکہ انفاس سے ہے۔ ہر شخص کے باطن میں وہ شمس ٹمٹما رہا ہے۔ اس لیے طبعاً جب کوئی افضل نمونہ جیسے شیخ کو دیکھتے ہیں تو خود بخود دل گواہی دیتا ہے کہ یہ سچ ہے اور ٹھیک ہے۔

جب شیخ کے فیضان سے ارتقائے باطن کی منازل میں پہنچ کر انفرادی روح کی شعوری نشوونما ہوتے ہوتے روحِ کلّی کا وجدان حاصل ہوتا ہے تب اپنا عرفان ہوتا جاتا ہے اور پردے اٹھنے شروع ہوتے ہیں۔ یہ انکشافِ روح اس حد تک ہوتا جاتا ہے جس حد تک کہ سایہ شیخ میں اپنی فنا ہوتی جائے۔جسم و نفس کے بندھنوں سے روح کو آزادی ملتی جاتی ہے۔

اس سے پہلے شعور سے آزادی حاصل کرنے کا طریقہ ہے۔ (چشم بند و لب بند و گوش بند) آنکھ کو بند کرو، ہونٹوں کو بند کرو، کانوں کو بند کرو سب آزادی ہے۔طریقہ ہے جذب و محویت میں لامحدود سے ہم آہنگی ۔ پھر اس کے بعد جبلّی صلاحیتوں سے بھی آزادی ہے۔ جو کروڑوں سال پرانی ہیں۔ اس

کے بعد ہے کہیں روح کا مقام جہاں بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ زمان سے آزادی ملتی ہے۔ شیخ کامل ذکرِ خفی اور عشق کی پاکیزگی میں یہ منازل طے کراتا ہے۔ اس کے لیے قدم بہ قدم ارتقائے باطن ہے۔ پھر مقامِ انسانیت پر آکر روح کا فطری تجسس ہے جس کا پرتو خیال ہے۔ جب عشق کے طفیل یہی خیال قلب میں اترنے لگے، انہماک طاری ہونے لگے تو اسے ایک رخ ملنے لگتا ہے۔ قلب میں خیال اترنے کی دو ترکیبیں ہیں۔ ایک غم عشق میں ٹوٹا ہوا دل، دوسرا احسان میں ڈوبا ہوا دل۔ روح کی منازل تک اٹھانے کے لیے یہ عشق کا کتنا بڑا فیضان ہے۔ ٹوٹا ہو دل یا احسان۔ خوش نصیب ہے وہ جو کسی احسان میں اٹک جائے تا کہ اٹھا لیا جائے۔ روح کا چونکہ عالمِ امر سے تعلق ہے اس لیے اس مقام پر بہ اَمرِ کُن بس اٹھا ہی لیا جاتا ہے۔ یہاں اپنی کوشش اور مجاہدوں سے بات نہیں بنتی ۔ وہ حق تعالیٰ رحمٰن ہے رحیم ہے۔ شیخ کے دستِ کرم کے وسیلہ سے طالب کو اپنا لیتا ہے۔ یہ رحمانیت ایسی چیز ہے کہ اپنے اندر چاہے ہزار کثافتیں ہوں، ہزار ناامیدیاں ہوں، اس کی رحمانیت ہر چیز پر غالب آجاتی ہے۔ یہ ہے رحمت العالمینؐ کا احسان۔ اس احسان کو جس نے قبول کر لیا اسے نہ کسی بھٹی سے گذرنا ہے نہ منزل سے۔ وہ تو موج ہی موج ہے۔ اس نے رحمت کے دامن کو بہ طفیل عشق پالیا ہوتا ہے۔ اور یہ رحمت کا دامن کبھی نہیں چھوٹتا۔ یہ مقامِ جبروت ہے۔ گلے لگا لیا جاتا ہے۔

اب کہیں محبوب کو امر باللہ بنا کر مرضئ حق کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہ امر وہ امانت خودی ہے جو عطا ہوئی۔ اس امانت کو بے داغ بے آلودگی عقل وجسم و نفس، لوٹانا ہوگا۔ اس عہد پر قائم رہنے کی تکرار کے لئے نماز میں قیام اس خودی کا اقرار ہے۔ اور سجدہ اس خودی کو حوالے کر دینے کی نشانی ہے۔ اس لیے سادہ

نسخہ ہے کہ اپنی خودی کو اپنی 'مَیں' کو تو میں ضم کر دو۔ ذاتِ مرشد میں ضم کر دو۔ انائے انفرادی کو انائے مطلق میں ضم کر دو کیونکہ اس 'مَیں' اور تو کی توحید میں ہی انا کا بارِ امانت بے نفسی سے پاکیزگی کے ساتھ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس توحید کے استحکام کے لیے ہر عمل میں بسم اللہ ہے۔ ایک ہاتھ اے حق ذات تیرا ایک میرا، دونوں ایک اکائی ہیں۔ اس طرح حق کی صفات کی عمل پیرائی میں یہ بسم اللہ ہے۔ اسماء کو اپنانے، اسماء کی معنویت خود ہو جانے پر یہ بسم اللہ ہے۔ ذکر کو اپنانے، ذاکر کا خود مذکور ہو جانے میں یہ بسم اللہ ہے۔ میں اور تو کا ساتھ ہو جانے میں یہ بسم اللہ ہے۔ یہ توحیدِ عمل کی نعمت ہے جو اسلام نے دی۔ ایسی توحید کہ اپنے ہر عمل میں اللہ ساتھ اور ہر عمل اللہ کے لئے۔ اس طرح کھانا، پینا، سونا، جاگنا، چلنا، پھرنا، غرض زندگی کا ہر عمل، حق کی معیت میں حق کے لئے ہوتا ہے۔

اب غور کریں تو تعینات سے ماوراء ذات کو کسی فہم، کسی گرفت میں لانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اپنی باطنی سطح سے ہر عمل پیرائی میں اسماء وصفات کی تجلی ہی میں اس جانب رخ کیا جا سکتا ہے۔ اسماء کی اصل ربوبیت ہے جو ربوبیت شیخ میں پروان چڑھتی ہے۔ اور صفات کی اصل الٰہیت ہے، جو انسان کی فطری صلاحیتوں میں ودیعت ہے۔ اسم مسمّٰی کی خصوصیات بیان کرتا ہے، اور صفت اپنے موصوف کی حالت اور افعال بیان کرتی ہے۔ رہی ذاتِ حق تو وہ اسماء وصفات سے کسی فہم میں تو آ سکتی ہے، مگر اسماء وصفات سے پاک ہے۔ یہاں تک کہ انسان کی ذات بھی اپنے اسماء وصفات، جسمانیت، میکانیت سے پاک ہے۔ مادہ، مقصد، حرکت، قوت سے بے نیاز ہے۔

اسماء وصفات الٰہی کو لیں تو اسماء وصفات کا مرجع سات مقررہ اصولوں

پر ہے جو اُمّہاتِ اسماء ''حیٌ ،علیمٌ،قدیرٌ مریدٌ سمیعٌ حکیمٌ بصیرٌ'' ہیں۔ اور جن کا ظہور سات صفات یعنی حیات ،علم، قدرت، ارادہ سمع، بصر کلام پر ہے۔حدیث مبارک ہے، جس نے 99 ناموں کی حقیقت پالی وہ جنت میں جائے گا۔تو ظاہر ہے کہ یہ صرف جاننا نہیں ہے بلکہ پانا ہے۔حق الیقین کی بات ایسی ہے کہ بہ طفیل بسم اللہ جیسے حق کے ساتھ عمل پیرائی میں کسی شخص کو خود اپنی صفات کا اپنے پر عیاں ہونا ظاہر ہوجاتا ہے، کہ وہ زندہ ہے،علم رکھتا ہے، قدرت رکھتا ہے، ارادہ رکھتا ہے دیکھتا ہے،سنتا ہے، بولتا ہے۔ یہ عرفانِ حق، اجمالی طور پر اپنی مجازی یکسانیت میں حاصل ہوتا ہے۔یعنی ایک وحدتِ کلّی میں اپنے عرفانِ ذات کی مجازی جھلک ملتی ہے۔آگے بڑھنے کے لئے اسا اپنائے ہیں۔ بلکہ پڑھنے پڑھانے میں لگ گئے تو ہزاروں سال بھی کافی نہیں۔ اسم کا تو مسمّٰی سے ذرا سا ہی حجاب ہے لہٰذا اسم کا پڑھنا نہیں ہے بلکہ برزخِ شیخ میں محو مستغرق ہو کر اپنانا ہے، ہو جانا ہے۔وہ اس طرح کہ محبوب اندر ہے، حق اندر ہے۔میرا جسم عمل کا میدان ہے کوئی دوئی نہیں۔میرا رخ ایک ہی جانب ہے، محبوب کی جانب، حق کی جانب۔حق کا ساتھ ہے۔ ایک ہاتھ میرا ایک ہاتھ تیرا۔ نہ تیرے بغیر میں، نہ میرے بغیر تو، یہ تخیلی بات نہیں۔ یقین بالذات کی چیز ہے جو ارتقائے روحانی ہی میں ممکن ہے۔ اس لیے اسم میں بڑی حقیقت ہے۔

میرے اور حق کے درمیان اسم کا مقام ہے جو حق اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان حضرت علیؓ کا ہے۔ عَلِیٌ بَابُھا۔حضرت علیؓ سے یہ سلسلہ شیخ تک پہنچا اس لئے شیخ کا ذکرِ خفی بہ امرِ ربّی عطا کرنا خود اپنی ذات کو عطا کرنا ہے۔ بہ طفیل ذکرِ خفی جب عشق جاگا تو فنا در فنا کی منازل طے کر کے شیخ،

رسول صلی اللہ علیہ وسلم ، اللہ کی توحید میں بقا ملی ۔ عَرَفَ نَفْسَہٗ مَیں اور تُو کا رابطہ ہوا۔ بہ برکتِ بسم اللہ شیخ کی برزخ میں اسماء و صفات باری سے رابطہ ہوا۔ میری مجازی صفت پر حقیقی صفات کی تجلی ہوئی مَیں اور تو ایک ہوئے بس تُو ہی رہ گیا۔

اس طرح جب طالبِ حق عشق یا علم یا عبادت کے ذریعہ اس محبوب کا ظِل بن جاتا ہے،تو اب طالب ومطلوب میں فرق نہیں رہتا۔ اس کا دیکھنا اس کا دیکھنا۔ اس کا بولنا اس کا بولنا ہوجاتا ہے۔ گویا ایک ہی حقیقت کلّی ہے جو اس میں سے آشکار ہو رہی ہوتی ہے۔ یہ حقیقی ''مَیں'' جس میں سے اسے شک کی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ پرتو ذات ہے، جس تک ہر ایک کو پہنچنا ہے۔ یہ 'مَیں' مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ کے مقام کی ہوتی ہے اور اس کی روح اس کی تصدیق کر رہی ہوتی ہے چونکہ یہ الست میں دیکھی ہوئی چیز کی پہچان ہے اس لیے اب یہ عَرَفَ رَبَّہٗ کی بات ہے۔

یہ ہو جانا درجہ بدرجہ اس طرح ممکن ہو سکا ہے کہ بہ طفیل عشق و برزخ شیخ، اپنی جان اور روح کی تڑپ کی طرف استغراق حاصل کیا تو اسماء کی معنویت اور حقیقت طاری ہوئی۔ بہ طفیلِ بسم اللہ حق کے زندہ ساتھ میں اسماء میں قیام کیا۔ یہ حضوری اور غوطہ لگانے کی بات ہے۔ جب اسم کو سمو کر محبوب کی ذات کو اپنے میں سمو لیا تو شدّت ذکر میں محبوب ہی اپنے میں بس گیا۔ 'مَیں' تو کا فرق اٹھ گیا۔ جب حق اپنے میں جلوہ گر ہوا، کُن کے زور میں رائی کے دانے کی طرح وجود پھٹا، پھر پانی کے پھیلنے کی طرح پھیلے۔ حیؐ کا ظہور ہوا۔ الحیات میں قیام کیا۔ تب کہیں اپنے حق ہونے کا شعور آیا۔ ''لا الہ الا اللہ'' اب کہیں حق ہو کر توحید میں قدم رکھا۔ تو ازن میں آئے۔ سب الہ مٹے اپنا بھی

مہارت 'مَیں' مٹا۔ اللہ ہی خود ہے۔ ہر دم ہے انَا دہر کی آگہی ملی۔ دریائے حقیقت اپنے ہی میں بہتا پایا۔ یہ دریا خواہ زمان کا ہو، مکان کا ہو یا زندگی کا، اسے اپنی خودی سے ہم آہنگ پایا۔ یہ گویا کُن کے انداز میں اپنے میں سے کسی اور کی کارفرمائی ہے۔ شدّتِ ذکر وفکر میں نورِ محبوب ہی اپنے اندر بس گیا ہوتا ہے۔ تعینات کے پردے ہٹ چکے ہوتے ہیں۔ ہےتو وہی ہے۔ غیر کی گنجائش کہاں۔ اب کلمہ ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کی خود تصویر ہوئے۔ باقی ہے تو محبوب کی صورت ۔ یبقیٰ وَجہُ رَبّک اب ساری زندگی نے اپنی حقیقت کو پا لیا ہوتا ہے۔ اب حقیقت بالغیب سے روشناس ہو چکی ہوتی ہے جو اپنے اندر بھی جلوہ گر ہے۔ اب کن فیکون کی شدّت حال میں دیکھا کہ مَیں خود ہی ہوں جو تخلیق عالم کے باطن کی عکاسی کر رہا ہوں۔ یہ الحیات، روحِ اعظم، حیٌّ و قیّوم کی مستی ہے۔ خود آگہی کی مستی ہے۔

ان انوارِ ذات کے آگے، اس ہونے، اس خود آگہی کے آگے نہ خیال ہے، نہ اَمر اس کے آگے بس 'ہے' اس 'ہے' کے شعور کو عرفانِ ذات کہہ لو۔ ذات چونکہ بےنشان ہے اس لیے یہی کہا جا سکتا ہے کہ 'ہے'۔ اس 'ہے' کا جو انتہائی شعور ہوسکتا ہے وہ ہے نورِ محمدیؐ ۔ اس نورِ محمدیؐ کے انوارِ رحمت کا کوئی وجود بھی نہیں ہے۔ کیونکہ کُن سے پہلے ھُوَ الاول، وہ حق کا جلوہ جو ہے وہ ہے نورِ محمدیؐ۔ ہم وجود میں ہیں اس نکتہ کو پکڑنا پڑتا ہے۔ بلکہ یہ رحمت ہمیں خود پکڑتی ہے۔ یہ اِلّا بسلطان والی بات ہے۔ ایک جلوہ بالسلطان ذات کی لطافت ہے۔

ذات کو ذات ہی پہچان سکتی ہے۔ اس لیے 'ہے' کی بس واردات ہی

ہوتی ہے۔ یہ ہے کہ واردات، کائنات اور خالق کائنات کے ساتھ یکتائیت وجود ہے کہ نہ میں رہا نہ تو رہا نہ عشق رہا۔ بس ھُو ہی ھُو ہے۔ اس ھُو میں کھو جانا ہے۔ یہ اپنی خبر، نہ تیری خبر، نہ خبر کی خبر۔ نہ ناظر نہ منظور۔ بس ایک تجلی کا سراپا ہے۔ صفات غائب، اسماء غائب۔ جس کو دوام ہے وہ ذات 'ہے' اور بس 'ہے'۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔

حقیقت کی گواہی ہے

❀❀❀❀